ناول ''دویہ بانی'' کی قرأت

انسان دوستی کے تناظر سے

ڈاکٹر اویس احمد

میں اپنی بات کا آغاز پروفیسر شمیم حنفی کے ایک سوال سے کرنا چاہوں گا کہ'' کیا دنیا کی کوئی ادبی روایت انسان دُشمن بھی ہوسکتی ہے؟ اور کسی بھی زمانے یا زبان کا ادیب، انسان دوستی کے ایک گہرے احساس کے بغیر کیا اپنے حقیقی منصب کی ادائیگی کرسکتا ہے۔؟'' ادب کی جو بھی تعریفیں رہی ہیں ؛ بہر حال ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ادب اعلیٰ انسانی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے اور انسانی اقدار کا تحفظ انسان دوستی کے تصور کے بغیر ناممکن ہے۔ ادب ہر دور میں انسانی عظمت، مساوات اور غیر منقسم معاشرتی نظام کا جانب دار رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ادب ہر دور میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مطلقیت سے بالاتر ہوکر انسانی ذات کا متلاشی رہا ہے۔ چوں کہ انسان دوستی میں انسانی وحدت کو ایک طرح سے مطلق العنانیت حاصل ہے؛ لہذا ادب نے بھی اس تصور کے پیش نظر انسانی ذات کی عظمت وحُرمت، انسانی شرف و فضیلت اور انسانی اقدار کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں ادب نے

اُن تمام فکری رویوں کو بھی ضرورت پڑنے پر رد کر دیا جو انسان دوستی کو ایک مستحکم بنیاد عطا کرنے میں قدغن لگاتے رہے ہیں۔ جب ہم اردو ادب پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہماری نظریں ایک اچھے خاصے ادبی ذخیرے پر ٹھہرتی ہیں جو انسان دوستی کی اعلیٰ قدروں کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی غضنفر کا ناول ''دویہ بانی'' بھی ہے۔ جس میں دلت طبقے پر برہمن شاہی نظام کے استحصال اور طبقاتی و مذہبی تفریق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن اس ناول میں بالک کا کردار انسان دوستی کے تناظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ وہ برہمن شاہی نظام کا زائیدہ ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر انسان دوستی کا گہرا احساس رکھتا ہے۔

ناول ایک ایسے دردناک منظر سے شروع ہوتا ہے جہاں انسان دوستی، محبت اور ہمدردی دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف اس منظر کو دیکھتے ہوئے اشرف المخلوقات کے شرف سے مشرف انسان پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک انسان طبقاتی و مذہبی منافرت کی آڑ میں دوسرے انسان کے ساتھ انسان دشمنی کی تمام حدود پھلانگ لیتا ہے۔ مذکورہ ناول میں برہمن شاہی نظام کی مذہبی وطبقاتی اجارہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے جہاں نچلے طبقے کو انسان دشمن ہی نہیں بلکہ اس لائق بھی نہیں سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکے۔ مذہبی اجارہ داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جھگرو جو ایک شودر ہوتا ہے، غلطی سے کہیں دویہ بانی سنتا ہے تو اُسے سزا کے طور کانوں میں پگھلا ہوا شیشہ ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن اس مذہبی انتہا پسندی کے انسداد کے لیے ناول نگار نے بالک کی صورت میں ایک ایسا کردار گڑھ لیا ہے جو انسان دوستی، محبت اور اخوت کا استعارہ ہے۔ وہ اپنے ہی برہمن شاہی نظام کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور انسان دشمنی اور نفرت کی اُن تمام دیواروں کو تہس نہس

کر دیتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دینے کی راہ ہموار کر دیتا ہے جہاں مذہبی اور طبقاتی تقسیم کی بنیاد پر انسان دوستی اور بھائی چارے کا قلع قمع نہ کیا جائے۔ ناول کا پہلا ہی منظر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ جب کسی معاشرے میں کسی ایک طبقے کی اجارہ داری قائم ہوتی ہے تو وہاں انسان دوستی کا تصور باقی نہیں رہتا ہے۔ وہ منظر ملاحظہ کیجیے جس میں انسان پر حیوانیت غالب آ کر جھگرو کی چیخیں انسانیت کے کانوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی ہیں۔:

''ہون کنڈ کے چبوترے کے نیچے پتھریلی زمین پر جھگرو کسی بلی چڑھنے والے جانور کی مانند پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ آنکھوں کے ڈلے باہر نکل رہے تھے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ رگڑ سے جسم کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔ اور اُس سے خون رس رہا تھا۔ اُس کی کرب ناک چیخ دور دور تک گونج رہی تھی۔ ۔۔مگر بابا کے چہرے پر اضطراب کے بجائے اطمینان تھا۔ اُن کی آنکھوں میں چمک دمک بھی تھی۔'' (ص ۵)

برہمن شاہی نظام کا زائیدہ ہونے کے باوجود بھی بالک برہمن شاہی فکر نہیں رکھتا ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے ایک فرد کے ساتھ مذہب، ذات پات اور نسل کی بنیاد پر استحصال پر انسانیت اور اخلاقیات کے درس کو ترجیح دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالک برہمن شاہی نظام کے خلاف بغاوت کی علم بلند کرتا ہے جس نظام میں وید یہ بانی یعنی مقدس کلام بھی برہمنوں ہی کی ملکیت ہے۔ بالک کے ذہن میں بار بار یہ بات آ جاتی ہے کہ برہمن اور شودر میں تخلیقی اعتبار سے بھلے ہی کوئی فرق نہیں ہے لیکن سماجی اعتبار سے اُن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بالک اسی فرق کو جاننے کی

کوشش کرتا ہے اور اُس کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات اُبھرتے ہیں جن کا جواب وہ پورے ناول میں تلاش کرتا ہے۔ دراصل جب کسی معاشرے میں محبت انسانی کی تمام صفات مٹ جاتی ہیں تو بنی نوع انسان نفرت، تعصب اور تفرقہ جیسی منفی صفات کو اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیتا ہے۔ اس طرح بنی نوع انسان کے تمام معاملات خواہ وہ مذہبی ہوں، اخلاقی ہوں یا معاشرتی ہوں منفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے افراد کو بھی اُس مخصوص مذہبی تناظر سے دیکھتا ہے جو دراصل اُس کی نفرت اور تعصب سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اسی مذہبی نفرت اور تعصب کو ناول نگار نے واضح کرتے ہوئے اُس فرق کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے جو ایک برہمن اور شودر میں ہے۔ یعنی برہمن کو اس لیے برتری حاصل ہے کہ وہ برما کے سر سے جنما گیا ہے جب کہ شودر اس لیے کم تر ہے کہ وہ برما کے پاؤں سے جنما گیا ہے۔ لیکن ناول میں اس طرح کی باتیں بالک کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ کیوں کہ وہ محبت، اخوت، مساوات اور انسانیت کی زبان سمجھ لیتا ہے؛ جہاں وہ انسانیت اور انسان دوستی کو ایک وحدت تصور کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسان دوستی ہی کو برہمن اور شودر کے وجود کا سرچشمہ بھی تسلیم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالک برہمن اور شودر کے درمیان فرق کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ اُس کا ذہن بار بار اس بات کی طرف جاتا ہے کہ۔:

> ''سیدھا جسم۔ دو پاؤں۔ پاؤں کے اوپر پیڑو، پیڑو کے اوپر پیٹ، پیٹ کے اوپر چھاتی، چھاتی کے اوپر کندھے، کندھوں سے جڑے دو ہاتھ، دونوں ہاتھوں میں پانچ پانچ انگلیاں، کندھوں کے بیچ گردن، گردن کے اوپر چہرہ، چہرے میں ایک منہ، ایک ناک، دو آنکھیں، دو کان، ایک پیشانی، پیشانی کے اوپر سر، سر میں بال۔ سب کچھ تو

ہمارے جیسا ہی ہے۔''

لیکن محض دو یہ بانی کے چند بول سننے پر جھگرو کو سزا کے طور جب کانوں میں پگھلا ہوا شیشہ ڈال دیا جاتا ہے تب بالک کو ایک ایسا فرق نظر آتا ہے جو اُس نے گمان تک نہیں کیا ہوتا ہے۔لیکن وہ فرق کوئی فطری نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ایسا فرق ہوتا ہے جو انسان دوستی اور خلقِ خدا کی محبت پر ایک ایسے دھبے کی مانند ہوتا ہے جو خلق اللہ سے نفرت،انسان دشمنی،تعصب اور مذہبی رواداری کا نتیجہ ہوتا ہے۔جسمانی اعتبار سے برہمن اور شودر کی یکسانیت میں اب ایک واضح فرق بالک کو محسوس ہو رہا ہے۔:

> سیدھے جسم میں جھکاؤ، پاؤں پتلے، پیٹ دھنسا، چھاتی دبی، کندھے جھکے، ہاتھ سوکھے، انگلیاں ٹیڑھی، گردن رگوں سے اٹی، چہرہ پیلا، ناک رینٹ سے سنی، آنکھ ڈھیڈ کیچ سے بھری، ماتھا سکڑا۔(۳۰)

ناول میں اُس مخصوص معاشرے کے نظام کی تصویر کشی کی گئی ہے جو محبتِ بنی نوع،حقوق انسانی اور مذہب انسانیت کو فروغ دینے سے متصف نہیں ہے بلکہ اُس میں فرد کی ذات اور انا سیاسی،سماجی و مذہبی قوتوں پر غالب آجاتی ہے۔حالاں کہ انسان دوستی انسان کی عظمت اور اس کے حقوق ؛خواہ وہ کسی بھی نوع کے ہوں،کو استوار کرنے پر مصر ہے۔انسان دوستی کے تصور کو جب ہم مذہبی تناظر سے دیکھتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب انسان کی عظمت،انسان کے حقوق،انسان کا احترام اور انسانوں کے درمیان ایک مضبوط رشتے کو استوار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔لیکن زیر مطالعہ ناول میں جس برہمن شاہی نظام کی عکاسی کی گئی ہے؛ اُس سے

یہ بات ضرور سامنے آجاتی ہے کہ بعض دفعہ مذہبی اجارہ داری ہی کو انسان دُشمنی کا ہتھیار بھی بنایا جاتا ہے۔ چناں چہ اشتیاق حسین قریشی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''اس (ہندومت) نے اپنے آغوش میں فلسفہ وضعیف الاعتقادی دونوں کی یکساں پرورش کی ہے۔'' اسی تناظر سے ڈاکٹر تاراچند ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان کا تمدن فطرتاً مرکب انداز کا ہے اس میں مختلف جماعتوں کے تصورات شامل ہیں۔ اس دائرہ میں وہ تمام عقائد ورسم ورواج مذہبی رسوم ادارے فنون، مذاہب اور فلسفے شامل ہیں جو مختلف مدارج ارتقا کے سماجی طبقات سے متعلق ہیں اس کے مجموعہ میں جو عناصر ہیں اُن کو متحد کرنے کی اس نے ہمیشہ کوشش کی ہے یہ کوشش ناکام ہوئیں تو ایک بے جان پرزوں کا مجموعہ بن کر رہ گئیں اور کامیاب ہوئیں تو ایک زندہ نظام ترقی پا گیا۔'' اس تناظر سے جب برہمن شاہی نظام پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس نظام میں ضعیف الاعتقادی نے خوب پرورش پائی ہندوستان کے مرکب نظام تمدن میں برہمن شاہی نظام مختلف عناصر کو متحد کرنے میں ناکام ہوا جس کی بدولت وہ ایک بے جان پرزوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ جب اس طرح کا ایک بے جان نظام وجود میں آتا ہے تو وہاں انسانیت کش عناصر کو مذہب اور قانون کی حمایت بھی حاصل رہتی ہے۔ جس میں دادا جیسے مذہبی اور قانونی ٹھیکے دار کو جھگرو، بالو اور بندیا جیسے افراد پر مظالم ڈھانے سے ہی اطمینان ہوتا ہے۔ اس ناول میں بھی یہی دکھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ جب معاشرے کی طاقتیں اور قوتیں مخصوص افراد کی انا اور ذات سے مغلوب ہو جاتی ہیں تو ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ذات پات اور طبقاتی تفریق کی بنیاد پر انسانی محبت اور احترام بھول جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انسان دُشمنی کے لیے مذہبی جواز بھی ڈھونڈ لیا جاتا ہے کہ ایک برہمن پر دو یہ بانی سننا

لازم ہی نہیں بلکہ اس کی حفاظت کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے؛ وہیں دوسری طرف ایک شودر کے لیے دو یہ بانی سننا گناہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اگر غلطی سے بھی اُس نے دو یہ بانی سنی تو وہ سزا کا حق دار تو ہوگا ہی اور تو اور اُس پر دیوتا کا شراپ بھی چڑھ جاتا ہے جو دھرتی کے ختم ہو جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کہاں انسان دوستی کا تصور جو ہر طرح کی تفریق اور انتشار کو ختم کر دیتا ہے اور جس کے تحت انسان کو مظہرِ خدا تسلیم کر کے انسان کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا ہے اور کہاں برہمن شاہی نظام کی انسان دُشمنی کا تصور جہاں انسان کو کیڑے مکوڑوں کی طرح پیروں تلے روندا جاتا ہے اور ماتھے پر شکن تک نہیں آتی ہے۔ یہاں ناول نگار نے انسان دوستی کے پیش نظر برہمن شاہی نظام کی طبقاتی و مذہبی ناہمواریوں کو موضوع بنایا ہے۔ مخصوص معاشرے میں انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کا استحصال اور جبر و ظلم روا رکھنے کی رسومات اور توہمات پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا بین ثبوت فراہم کیا ہے کہ ادب کا ایک مقصد آفاقی انسانی قدروں کو فروغ دے کر انسانی عظمت کی قدر و قیمت کا تعین کرنا بھی ہے۔ ناول میں دیوتا کے شراپ کا ڈر دکھا کر نچلی ذات والے لوگوں کو اپنے دیوتا سے الگ رکھا جانا، اپنے ہی دیوتا کے شلوک سننے کو گناہ قرار دیا جانا، غلطی سے دو یہ بانی کے بول سنائی دینے پر سزا کا حق دار ٹھہرائے جانے اور ضرورت پڑنے پر دو یہ بانی کی حفاظت کے پیش نظر کسی کا قتل کر دینے کو جائز ٹھہرانا دراصل اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ جب انسانی قدروں کا احترام اور انسانی وقار کے عناصر کو متحد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے تو ایک ایسا نظام وجود میں آتا ہے جو بے جان پرزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

لیکن دوسرے زاویے سے اگر دیکھا جائے تو ناول نگار نے اُن پہلوؤں کی

طرف بھی نشان دہی کی ہے جن سے انسانی اقدار اور انسانی شرف و عظمت و فضیلت کی بازیافت ہوتی ہے یا یوں کہہ لیجیے ناول نگار نے برہمن شاہی نظام کا ایک ایسا رخ بھی دکھایا ہے جو محض انسان دوستی اور انسانی وقار کا زائیدہ ہوسکتا ہے۔ جب بالک اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ نچلے طبقے کے لیے دویہ بانی سننا اتنا سنگین جرم کیوں ہے تو اُسے یہ انکشاف ہو جاتا ہے کہ۔:

> ''اس بانی کے نِکٹ سے آنے سے اُن کی اندریاں بھی جاگ اُٹھیں گی۔ اور یدی اُن کی اندیاں جاگ پڑیں تو اُن کا من بھی مہک اُٹھے گا۔ اُن کا مکھ منڈل بھی مسکان سے بھر جائے گا، اُن کی تو چا سے بھی کرن پھوٹ پڑے گی۔ اُن کے روپ پر بھی رنگ چڑھ جائے گا۔'' (۴۴۔۱۴۳)۔

یہاں تک آتے آتے ناول نگار کے تصورِ انسان دوستی اور مذہبی و طبقاتی تفرقہ سے اُوپر اُٹھ کر انسانی وقار اور عظمت کی بحالی کی واضح کوششوں کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کی طرف انگشت نمائی کرتا ہے کہ جس معاشرے میں انسان کو مظہر خدا تسلیم کر کے اُس کے شرف اور فضیلت کو ظلمت کدے سے آزاد کر دیئے جانے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو سب کے دل دیوتا کے مقدس کلام سے منور ہو جاتے ہیں، سب کی روحیں مہک اُٹھتی ہیں، سب کے چہروں پر رونق چھا جاتی ہے اور سب کے وجود معطر ہو جاتے ہیں۔ جب ان باتوں کا انکشاف بالک پر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوست بالو کو مقدس کلام سننے پر مجبور کر دیتا ہے اور بالآخر سنا ہی دیتا ہے۔ اب جو تبدیلیاں بالو میں رونما ہوتی ہیں وہ بالک کے دادا کو راس نہیں آتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی پوتے یعنی بالک کے دوست کا قتل کر دیتا ہے۔ ناول نگار نے

برہمن شاہی نظام کی انسانی دُشمنی کے ہر ایک پہلو سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ایک انسان کو تحصیل علم سے محروم رکھا جاتا ہے تاکہ کہیں علم سے اُس کے ذہن کے دریچے کھل نہ جائیں، اُس کا دل علم کے نور سے منور نہ جائے اور کہیں ذات پات، بھید بھاؤ اور طبقاتی تقسیم کی عمارت زمین بوس نہ ہو جائے۔

ناول میں ایک طرف باُمھن ٹولہ ہے جہاں برہمن رہتے ہیں، جو نہایت صاف ستھرے اور اچھے مکانوں میں رہتے ہیں اور دوسری طرف چمٹولی ہے جہاں شودر رہتے ہیں جو نہایت ہی میلے کچیلے گھروں میں رہتے ہیں۔ یہ طبقاتی تقسیم برہمن شاہی نظام کا زائیدہ ہے۔ لیکن یہاں بالک کا کردار انسان دوستی کے تناظر سے مثالی کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ وہ ناول میں جگہ جگہ انسان دوستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ اپنے دوست کے والد کی تیمارداری کے لیے چمٹولی بھی جاتا ہے جہاں کی تنگ و تاریک گوبر اور کیچڑ سے بھری گلیوں میں کسی برہمن کے جانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔ جہاں گندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب وہ اپنا باُمھن ٹولہ نہایت ہی صاف و شفاف دیکھتا ہے تو اُس کے ذہن میں کئی طرح کے سوال اُبھرتے ہیں کہ جو لوگ برہمنوں کے گھروں میں صاف صفائی کرتے ہیں اُن کے اپنے گھر اتنے گندے کیوں ہیں؟ یہاں پر اُسے سوامی جی کی بات یاد آجاتی ہے کہ کہیں یہ لوگ واقعی میلے کچیلے رہنا ہی پسند تو نہیں کرتے ہیں، کہیں یہ گندگی ہی کو تو نہیں چاہتے ہیں، کہیں انھیں گندگی ہی پسند تو نہیں ہے۔ اس برہمن شاہی نظام میں نہ صرف آبادی کو تقسیم ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے بلکہ وہاں کے پانی تک کو بھی تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک طرف ندی ہے جس میں صرف اور صرف برہمن ہی نہا سکتے ہیں۔ غلطی سے بھی اُس میں کوئی شودر نہیں نہا سکتا ہے، نہیں تو وہ پانی اَشد سمجھا جاتا ہے۔ دوسری

طرف ایک گندہ نالہ ہے جس میں سبھی شودر نہاتے تھے، جس کا پانی نہایت ہی گدلا اور بدبودار ہے۔ ناول نگار بار بار اس بات کو ذہن نشین کراتا ہے کہ جب کسی معاشرے میں انسان دوستی کے عناصر بکھر جاتے ہیں تو اُن عناصر کو متحد کر کے انسانی وقار کو اُستوار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ ادب کے تناظر سے انسان دوستی کا تصور ایک طرف انسان کے معاملات میں گہری دلچسپی کا تقاضا کرتا ہے تو دوسری طرف انسان سے خود اپنی جدو جہد اور قوت بازو پر اعتماد کا تقاضا کرتا ہے۔ انسان دوستی کے اسی تقاضے کے پیش نظر ناول نگار انسان دوستی کی وکالت کرتے ہوئے نچلے طبقے کی آواز بنتے ہوئے یہ واضح کراتے ہیں کہ نچلے طبقے کے لوگ علم کی دولت سے دور نہیں رہنا چاہتے ہیں بلکہ اُنھیں اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ اُنھیں علم حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، وہ مذہب سے دور نہیں رہنا چاہتے ہیں بلکہ اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ بھگوان ایسا ہی چاہتے ہیں، وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتے ہیں لیکن اُنھیں اس بات کا یقین دلایا جاتا ہے کہ برہمن کے لیے جھوٹ بولنے سے اُنھیں پونیہ ملیں گے، وہ گندگی میں رہنا پسند نہیں کرتے ہیں بلکہ اُنھیں اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ صفائی اُن کا مقدر نہیں ہے، وہ گندے نالے میں نہانا نہیں چاہتے ہیں لیکن اُن کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ اُن کی وجہ سے پانی اَشُد ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بالو میں دو یہ بانی سننے سے تبدیلی نہ آتی۔ اُس کا دل دو یہ بانی یعنی مقدس کلام سے منور نہ ہوتا، اُسے صفائی اور گندگی کے درمیان امتیاز نہ ہوتا۔

اسی طرح جب بالک کے گھر بالو کو باسی کھانا کھلایا جاتا ہے اور بالک اُس کھانے کو چکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ منہ میں نوالا ڈالنے کے فوراً بعد کھانا اُگل دیتا ہے کیوں کہ اُس کے حلق میں جلن محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح کے کھانے سے اُسے

بھگوان شنکر کی یاد آتی ہے کہ اُس نے اگر وِش سنسار کے کلیان کے لیے پیا تھا تو بالواس طرح کا کڑوا کھانا کھا کر کس کا کلیان کرنا چاہتا ہے۔؟ دوسری طرف بالک کو چمٹولی کی ایک لڑکی بندیا سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ وہی بندیا ہے جو بالک کے دادا کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہے لیکن اُس کے باوجود بھی بالک بندیا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے دادا کے گناہ کا پرائشچیت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس بات کا پتا جب دادا کو چل جاتی ہے تو وہ نہ صرف اس رشتے سے انکار کرتے ہیں بلکہ بندیا کا قتل بھی کروا دیتے ہیں۔ حالاں کہ بالک کے ساتھ رہنے سے بندیا کی زندگی میں بھی کئی مثبت تبدیلیاں آ گئی تھیں؛ جن کو برہمن شاہی نظام نے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کیا ہے۔

حالاں کہ اگر دیکھا جائے تو دو یہ بانی جیسے مقدس کلام اور تحصیل علم سے انسان دوستی کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ جس طرح بالو اور بندیا انسانی شرف اور فضیلت اور انسان کی عظمت اور احترام سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اصل میں یہاں ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان دوستی تمام تر معاملات سے بالا تر ہے۔ وہ یہاں اس بات کو ذہن نشین کراتے ہیں کہ انسان سے محبت، اخوت، بھائی چارے اور مساوات کے ساتھ ساتھ تعظیم انسان کو کئی سماجی سطحوں جیسے سیاسیات، سماجیات، معاشیات اور مذہبیات سے بالا تر ہو کر ہی اُستوار کیا جا سکتا ہے۔ خیر دوسرا راستہ علم کا ہے۔ لیکن شودروں کو اُس سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ اُنھیں بس اتنا بتایا گیا ہے کہ پاٹھ شالہ جانا برہمنوں کے بچوں کا حق ہے۔ علم حاصل کرنا اعلیٰ طبقے ہی کا بنیادی حق ہے کیوں کہ وہ نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے دیوتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ نچلے طبقے کے لیے پاٹھ شالہ جانا بھی گناہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان پابندیوں کے باوجود بھی

اگر کوئی شودر ذات پات کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کی حالت جھگرو، بالو اور بندیا جیسی ہو جاتی ہے۔

لیکن بالک بالآخر اس ناول میں انسان دوستی کے پیکر کے طور پر سامنے آتا ہے اور وہ برہمن شاہی نظام کی مذہبی وطبقاتی تقسیم کو مٹانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے اور ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں انسان کی عظمت و رفعت کو مرکزیت حاصل ہے۔ناول کے ایک پڑاؤ پر بالک پر اپنے دادا کی حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے اور اُسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اُس کے دوست بالو اور محبوبہ بندیا کے قتل کے پیچھے بھی دادا ہی کا ہاتھ ہے۔حالاں کہ ناول میں اُس کی ہر ایک کوشش انسان دوستی اور محبت انسانی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔وہ اپنے دوست بالو کو دو یہ بانی سنا کر اُس کے من کے دوار کھولنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔وہ طبقاتی تفرقے سے اُوپر اُٹھ کر بندیا سے شادی کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔اُس نے اپنے دادا کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جبر واستبداد کی عمارت کو زمین بوس کر دیا۔یہ ایک فطری بات ہے کہ جب کسی معاشرے میں جبر واستبداد کی تمام تر طاقتیں ختم ہو جاتی ہیں تو انسان دوستی اور عظمت انسان کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں۔بالک نے جب اپنے معاشرے میں تمام سطحوں سے اُوپر اُٹھ کر انسان کو مظہر خدا تسلیم کروایا تو بے باک ہو کر اعلان کر دیا۔:

> ''آج سے اُدھر والے بھی اپنے بچوں کو پاٹھ شالہ بھیجیں۔۔۔آ گیا نہ ماننے والے کو دنڈ دیا جائے گا۔''(ص ۱۵۷)

بہر کیف ناول میں بالک ایک ایسے کردار کی صورت میں نظر آتا ہے جو وحدت انسانیت کا تصور رکھتا ہے۔یعنی انسانیت اور انسان دوستی کا ایک ایسا تصور جس

کے تحت پورا معاشرہ باہمی اتحاد و محبت کے ساتھ رہ سکتا ہے۔ بالک کا کردار بار بار ایک ایسے نظام کو تشکیل دینے کا تقاضا کرتا ہے جہاں نہ صرف انسان کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہو بلکہ اُس کی جان کا احترام بھی کیا جا سکے، اُس کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کیا سکے اور جہاں جبر و استبداد کے خلاف آوازِ حق بھی بلند کی جا سکے۔ پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''ہمارے یہاں ایک بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انسان دوستی نے ایک نعرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔'' لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب نظام جبر و استبدادی کا ہو تو وہاں انسان دوستی، حق پسندی و انصاف پروری کا شدید احساس دلانے کی ضرورت پڑتی ہے یعنی اُس نظام کو انسانی عظمت کا احساس دلانے کے لیے بعض دفعہ دو دو ہاتھ کرنے کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ اگر آپ میں اُس طرح کی ہمت نہیں ہے تو بالک کے باپ کی طرح آپ ظلم و جبر کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونے کے بجائے راہِ فرار اختیار کریں گے۔ ادب میں انسان دوستی کا احساس اس لیے شدت اختیار کر لیتا ہے کہ یہاں یہ تصور کسی بھی مصلحت کا شکار نہیں ہو جاتا ہے اور یہاں اسے ایک نعرے کی صورت بھی اختیار نہیں کرنا پڑتی ہے۔ اس کی تائید کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں۔

> ''یہ (انسان دوستی کا تصور) ہر طرح کی مذہبی اور نظریاتی مطلقیت کے چنگل سے آزاد ہوتا ہے اور انسان کو اس کی ہستی کے تمام اسرار اور تضادات اور حدود اور کمزوریوں اور طاقتوں کے ساتھ سمجھنے پر اصرار کرتا ہے۔''

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب انسان دوستی کا تصور ایک انسان کو اپنے حقیقی منصب کے ساتھ ساتھ انسانی قوت سے روشناس کراتا ہے تو بالک

جیسے افراد مذہبی اور طبقاتی مطلق العنانیت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے برہمن شاہی نظام کے پروردہ سانپ (یعنی دادا) کو ہون کنڈ کے سامنے سر سے پکڑ کر تب تک نہیں چھوڑتے ہیں جب تک اُس کی سرخی سیاہی مائل زردی میں تبدیل نہیں ہو جاتی اور جب تک اُس کی آنکھوں کی چنگاریاں بجھ نہیں جاتیں۔ لیکن یہ سب کچھ اُس وقت ممکن ہو پایا ہے جب بالک کے اندر انسان دوستی کا ایک گہرا احساس موجود تھا جس نے اُسے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی ہمت دلا دی۔

☆☆☆